دائروں میں پھیلی لکیر

کشور ناہید

دائروں میں پھیلی لکیر

(انتخاب)

کشور ناہید

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

دائروں میں پھیلی لکیر

(انتخاب)

کشور ناہید

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
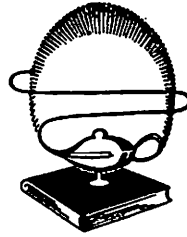
تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

بار اوّل نومبر ۱۹۸۷ تعداد 750 قیمت =/30

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی۲ میں طبع ہوئی

ترتیب

●●●

۴۔ ملامتوں کے درمیان (۱۹۸۱ء)

●●●

۵۔ سیاہ حاشیے میں گُلابی رنگ (۱۹۸۶ء)

▲▲

پیش لفظ

شعور اپنی ذات کا ہو چاہے اپنی دنیا کا، جب تک ایک سے دوسرے کی پہچان نہیں ہوتی، اسے ادھورا ہی کہا جائے گا۔ مغرب میں دوسری اور تیسری دہائی کے ادب نے اس میلان کو روایتی اور غیر روایتی کے بیچ ایک نئی حدّ فاصل سے تعبیر کیا تھا۔ یہ تعبیر تاحال مسترد نہیں ہوئی۔ کشور ناہید کے بارے میں سوچتے وقت، اس بات کی طرف دھیان یوں جاتا ہے کہ اس کے پورے سفر کا سب سے تابناک زاویہ یہی ہے۔ اُن لوگوں سے مجھے ہول آتا ہے جو شعور کا لفظ زبان پر آتے ہی ذات اور کائنات کی دوئی کو مٹانے پر تُل جاتے ہیں۔ مسئلہ اس دوئی کو مٹانے کا نہیں، بلکہ دونوں کی انفرادیت کو بچاتے ہوئے، ان کی باہمی ربط ضبط کی سمجھ کا ہے۔ مروّجہ مفہوم میں کشور کی شاعری نہ تو صرف اعتراف کی شاعری ہے۔ نہ صرف سوانحی، سماجی، سیاسی اور عمرانی مسئلے کی۔ اس شاعری کا کردار ایسے کسی بھی دائرے کا پابند نہیں۔ شاید ہو بھی نہیں سکتا۔ جتنا پیچیدہ یہ عہد اور اس عہد کا انسان ہے، اُس کی ساری جہتوں کو تصورات کے ایک دائرے میں سمیٹنے کی جستجو بے کار ہے۔

کشور کی نئی کتاب "سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ" کی ایک نظم کا عنوان ہے: دائروں میں پھیلی لکیر۔ استعارے کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ آج کے انسان اور اس کی ہستی کا جبر بننے والے سیاسی، سماجی، عمرانی ماحول کا آپسی رشتہ بھی یہی لکیر اور دائروں کا ہے۔ کتنے خانوں میں بٹ جانے کے بعد بھی لکیر کا تسلسل باقی رہتا ہے۔ اور یہی تسلسل ایک دوسرے سے الگ، چھوٹے بڑے دائروں میں قربت کا بہانہ بنتا ہے۔ عام زندگی کی بات اور ہے، لیکن ادب یا فنون کی دنیا میں نجی مسئلے بھی صرف نجی نہیں ہوتے، نہ ہی اجتماعی مسئلہ صرف اجتماعی ہوتا ہے۔ یہاں راز بانٹے جاتے ہیں اور ترسیل کے سوال پر لکھنے والا جو بھی رائے رکھتا ہو، پڑھنے والے کو وہ بہر حال اپنے

تجربے میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ اس سچ کی شہادت، ذاتی اور اجتماعی سوانح کی گرفت کے باوجود جتنے بڑے پیمانے پر ہمیں کشور کی شاعری میں ملتی ہے، اُس پر ہمارے زمانے کے بس تھوڑے سے شاعر پورے اترتے ہیں۔ یہ شاعری ہمیں ایک حساس اور باخبر فرد سے تو روشناس کراتی ہی ہے، ہمیں بھانت بھانت کے بندھنوں میں جکڑی دنیا کو بھی ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ نہ تو اس شاعری کا سیاق بننے والے دائرے ٹوٹتے بکھرتے ہیں، نہ ان دائروں میں پھیلتی لکیر کا تسلسل بگڑتا ہے۔ سو یہ شاعری ایک ساتھ جدید بھی ہے اور ترقی پسند بھی، اس کا آہنگ شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس میں اعتراف سے لے کر انکار اور احتجاج تک، آپ بیتی سے جگ بیتی تک، بہت سے دھارے شامل ہیں۔ دھاروں کی دشائیں الگ الگ ہیں۔ لیکن نہ تو یہ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں، نہ ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش۔ ان کی یکجائی ان میں سے کسی کی گم شدگی کا سبب نہیں بنتی۔

تجربوں کی قبولیت کے اسی مرحلے پر، ہر لکھنے والے کی تخلیقی طاقت اور مدافعت کا امتحان درپیش ہوتا ہے۔ کشور کی شاعری، اس اعتبار سے ایک غیر معمولی حسّی اور ذہنی پھیلاو کا احساس دلاتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کی فن کارانہ بصیرت کا بھی۔ لب گویا کی غزلوں سے سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ کی نثری نظموں تک کا سفر لمبا ہے۔ فکر کی کشادگی اور نئے تجربوں کی شناخت کے ساتھ، یہ بصیرت اپنے لہجے اور اظہار کی ہیئتیں بھی تبدیل کرتی جاتی ہے۔ تبدیلی کا عمل اگر خودکار ہو تو لفظ و بیان کے سانچے اس طرح بدلتے ہیں جیسے موسم بدلتا ہے۔ کشور کے فنی ادراک و احساس کی رفتار خاصی تیز رہی ہے، تاہم اُس پر کسی انہونی کا گمان نہیں ہوتا کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں زندگی کی رفتار بھی اتنی ہی تیز رہی ہے۔ مغرب نے تو خیر شعر کی جمالیات کو قلم اور روشنائی سے ٹائپ رائٹر اور کاربن تک پہنچا دیا اور سنگیت کاروں (پنک فلوایڈ) نے انسانی دل کے دھڑکنے کی آواز بھی دھات کے بنے ساز سے نکال لی، لیکن کشور نے تغیرات کے شور شرابے میں گھری دنیا سے اپنی وابستگی کے ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کا آہنگ محفوظ رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے نظم سے زیادہ موزوں غزل کی صنف تھی۔ کشور کی شاعری میں بھی غزل اور نظم کے رنگوں کا فرق صاف ہے۔ نظم میں لہجے کی

عجمیت، غزل کے برعکس، بتدریج کم ہونے کی بجائے، ایک بڑی جست کی طالب تھی. میرا خیال ہے کہ لگ بھگ اُنہی دنوں، معاصر عہد کی عالمی شاعری اور تنقید، خاص طور پر تیسری دنیا کے ادب کو کشور نے جو ترجمے کا موضوع بنایا، تو یہ بھی اپنی داخلی ضرورت کے تحت. اسی لیے، بیان کی وہ شاعری جو ہمیں گلیاں، دھوپ، دروازے اور ملامتوں کے درمیان اور سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ میں ملتی ہے، اسے بے نام مسافت کی پابند نظموں سے جھانکتی ہوئی بصیرت کا اگلا قدم سمجھنا چاہیے ۔ بعد کے ان تینوں مجموعوں کی نظمیں اپنی بُنَت اور ماہیت، دونوں کے لحاظ سے وسعت پذیر ہیں. اس عمل میں تجربے اور اس کی لسانی واردات کا توازن برقرار رہا ہے. کشور کی بیشتر نثری نظمیں، اسی لیے اکائیاں بن سکی ہیں. یہ نظمیں محض ذہن کی باغیانہ لے یا جذبے کے ہیجان کو سامنے نہیں لاتیں. ان سے ایک مرتب، متین، ضبط کی عادی مگر سرگرم حسیت کی تصویر اُبھرتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اچانک تبدیلی کی بھی اپنی منطق ہوتی ہے. مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بدلا ہوا دکھائی دینے سے بہت پہلے ہی بدلتے جانے کا عمل شروع ہوجاتا ہے. کشور کی شاعری میں تبدیلی سے زیادہ نمایاں عمل انجذاب اور دریافت کا ہے۔ اسے دیکھتے وقت ہم یہ بھی محسوس کرتے جاتے ہیں کہ تجربوں کی نئی فصل کے ساتھ باطن کا منظر یہ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ ذہن اور حواس متحرک ہوں تو اس تحرک کی چھاپ شعر پر لازماً پڑتی ہے. ایک اور پہلو جو اسی مسئلے سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ حسیت کے سفر میں لکھنے والا نئی دریافتوں کے ساتھ ساتھ، اپنی حسیت کے کچھ پرانے عناصر سے دست بردار بھی ہوتا جاتا ہے۔ یہ پورا سلسلہ ردّ و قبول کا ہے، اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت فطری۔ مگر اسی سلسلے نے ہمارے عہد کے ادب کو (اور فنون میں سب سے زیادہ مصوّری اور مجسّمہ سازی کو) ایک مضحک صورتِ حال تک بھی پہنچایا ہے۔ ردّ و قبول کا عمل جب تک اپنا جواز ساتھ نہ لائے، اور یہ جواز تجربے اور اظہار کی مجموعی سرگرمی کا حصّہ نہ بنے، اُس وقت تک اس پورے عمل میں اور بھڑچال میں کوئی فرق نہیں. کشور کے شعری سفر اور لب گویا سے سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ تک پھیلی ہوئی مسلسل کہانی پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کشور کی حسیت میں ترقی

اور توسیع اور تبدیلی کا ہر نشان ماحول کے جبر اور خود اپنی سائکی کے جبر سے یکساں تعلق رکھتا ہے۔ یہ دونوں جبر ایک دوسرے کی پہچان بنتے ہیں۔ اسی لیے، لب گویا کے بعد آنے والی ہر کتاب اپنے بعد کی کتاب کا عقبی پردہ دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا مفہوم جن حوالوں کی مدد سے متعین ہوتا ہے، ان میں ایک بنیادی حوالے کی حیثیت اسی عقبی پردے کو حاصل ہے۔ یہی وہ سطح ہے جس پر پس منظر اور پیش منظر کی دوریاں سمٹ جاتی ہیں۔

شمیم حنفی

حوصلہ، شرطِ وفا، کیا کرنا
بند مُٹھّی میں ہَوا، کیا کرنا

جب نہ سُنتا ہو کوئی، بولنا کیا
قبر میں شور بپا، کیا کرنا

قہر ہے لُطف کی صُورت آباد
اپنی آنکھوں کو بھی وَا، کیا کرنا

درد ٹھہرے گا وفا کی منزل
عکس شیشے سے جُدا، کیا کرنا

شمعِ کُشتہ کی طرح جی لیجے
دَم گھُٹے بھی تو گِلہ کیا کرنا

دِل کے زِنداں میں ہے آرام بہُت
وُسعتِ دشت نما کیا کرنا

میرے پیچھے مرا سایہ ہوگا
پیچھے مُڑ کر بھی بھَلا کیا کرنا

کچُھ کرو یُوں کہ زمانہ دیکھے
شور گلیوں میں سدا کیا کرنا

مَیں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی مَیں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

مَیں ترا رنگ ہر اِک مطلعِ در سے مانگوں
مَیں ترا سایہ ہر اِک رہگزر سے چاہوں

صحبتیں خوب ہیں خوش وقتیٔ غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

مَیں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
مَیں اُسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

آنکھ جب تک ہے نظارے کی طلب ہے باقی
تیری خوشبو کو میں کس ذوقِ نظر سے چاہوں

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید
مَیں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہُوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا

دستِ خیالِ یار سے پھوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا

ڈھونڈا اُسے بہت کہ بُلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دِل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یوں ہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہُوا نہ تھا

خزاں کا گیت

مجھ کو دیکھو تو پھر اس خیمۂ حرماں سے نکل کر دیکھو
دیکھو تو پیلے گلابوں سے بھی بڑھ کے
مرے رخسار کی پیلی رنگت
دیکھو وہ آنکھیں جنہیں خواب پرست
جھیل کہا کرتے تھے
اب وہی آنکھیں ہیں، غاروں کی طرح سے ویراں
اور وہی ہاتھ کہ جو تازہ شگوفوں سے بھی
نازک تھے کبھی
آج سوکھی ہوئی روٹی کی طرح خاکستر
اور وہ نقشِ کفِ پا

کہ جو رستوں کو گلابی کر کے
دائمی رقصِ بہاراں کے امیں ہوتے تھے
آج ہیں اُجڑے دیاروں کی طرح
تم کہ ہو خیمۂ حرماں میں مقیّد اب تک
خود کو اِک سایۂ شب کہتے ہو
اور پھر اپنے ہی سائے سے گریزاں بھی ہو
جھانک تو لو کبھی خُم خانۂ دِل کے اندر
اور کبھی دُنیا کا نیرنگ تماشا دیکھو
کچُھ نہ ہو تو یہ مرا اُجڑا سراپا دیکھو

اثبات

میرے ویرانۂ تن میں جاگا
زیست کا کامنی احساس
سبک ساریٔ ساحل کا فسوں
اور بے پایاں اُمڈتی ہوئی لہروں کا زبوں
مجھ سے پوچھا مرے ہر انگ نے
اب تو بولو!
کیا تمہیں پھول کے کھِلنے کا سبب ہے معلوم
مَیں ہنسی
اور مچی صحن میں دُھوم

خواب میں خواب کا ڈر

کِس نے کہا تھا اُن سے مِلو

بات بھی کرو۔

اینٹوں کا رنگ سُرخ ہے،

دیوار بھی ہے سخت

دیوار پہ جڑی ہُوئی شیشے کی ٹُکڑیاں

نازک ہتھیلیوں کو کریں گی لہولہان

آنگن میں اُس کے جھانکنے دیں گی نہ رات کو،

اب تو ہَوا کے ساتھ بھی باتیں کرو گی تم

دن میں تو دفتروں کے مشاغل بہت سے ہیں

راتوں کو دِل کا چور نہ سوئے نہ سونے دے

کنوارپنے کی سوچ

جواں لڑکیاں ٹین کی چھت کے اُوپر کھڑی
سوچتی ہیں
یہ گرمی جو پاؤں کو لپٹی ہوئی ہے
اگر سخت ٹھٹھرے ہوئے جسم میں پھیل جائے
تو ہلکی گلابی نسوں کو
دہکتے ہوئے سُرخ شعلوں کی بھٹی بنا دے
ہر اِک نبض کو نبضِ طوفاں بنا دے
ہر اِک سانس کو شعلہ ساماں بنا دے
ہر اِک خواب کو رشتۂ جاں بنا دے
مگر پھر یہ طوفاں زدہ زندگی

کیا یونہی پھر جھلستی ہوئی دُھوپ میں
ٹین کی چھت کے اُوپر کھڑے
آتے جاتے مسافر کے سائے کو تکتی رہے گی !

پہلا سفید بال

وحشت آمیز خیالوں کی لکیریں جاگیں
شعلۂ خواہشِ نایافت بھڑک کر چمکا
سائے لمبے ہوئے سب بیتے ہوئے برسوں کے
ذہن نے عمرِ گریزاں سے تعلّق باندھا

آئینہ ، ہوش کی مقراض بنا
پیش گوئی کے ہیولوں کے حوالے کر کے
کر گیا سینۂ سوزاں کی تپش کو ارژنگ
آتشیں زہر سا رگ رگ میں مری چھوڑ گیا
بے کراں شوق کی موجوں کا فسوں توڑ گیا

کالے بالوں میں وہ مرمر کی چمک

یخ سفیدی کے تناؤ میں نہاں
ڈھیلی پڑتی ہوئی گزرے ہوئے برسوں کی گرفت
مجھ کو اندیشوں کی دہلیز پہ لے آئی ہے
آئینہ، شوق کی تقصیر بنا!

یوُسُف کامران

وُہ تو مُجرم تھا محبّت کا
مَیں اُسے جانتی تھی
مَیں تو اُس شخص کے ہر نقص کو پہچانتی تھی
میں اُسے چاہتی تھی۔

وہ شفق رنگ، حیا جس کو کہیں
تھی یہی میری وفا کی تعبیر
وہ بہانہ جسے چشمک سمجھیں
تھی مرے تیرے تعلق کی نظیر۔

تُو کہ محبُوب مجھے تھا، مجھے معلوم ہے یہ

تُو کہ مُجرم تھا، مرے پیار
مری چاہت کا
تُو کہ دیوانۂ مخفیٔ محبّت تھا سدا
تُجھ کو کیا سُوجھی
کہ قدموں کے نشاں اُلجھا کر
چہرۂ زرد لیے
میری ہتھیلی پہ لگی مہندی کو دُھندلانے لگا
جیل کی گرم سلاخوں سے
مرے بچّوں کو تڑپانے لگا
تُو کہ مُجرم تھا محبّت کا
زمانے کو خبر کیسے ہُوئی!!

گھاس تو مُجھ جیسی ہے

گھاس بھی مُجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی، زندگی کی مُراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات گواہی بنتی ہے
شرمساری کی آنچ کی
کہ جذبے کی حدّت کی

گھاس بھی مُجھ جیسی ہے
ذرا سر اُٹھانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اُسے مخمل بنانے کا سودا لیے
ہموار کرتی رہتی ہے

عورت کو بھی ہموار کرنے کے لیے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو۔
نہ زمیں کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی
میری مانو، تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا
جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں
وہ پیوندِ زمیں ہو کر
یونہی زور آوروں کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں
مگر وہ پرِ کاہ ہیں
گھاس نہیں
گھاس تو مجھ جیسی ہے!

نیلام گھر

مَوت کا ذائقہ
لفظوں کے پیکر میں
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے ۔
وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے مُنہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے ۔
یہ حق بھی کیا عجیب ہوتا ہے ۔
حق جتانے کی خواہش
محکومیت کی ڈھال پہ اپنا چھتر بناتی ہے
حق جتانے کی خواہش
ہر کذب اور ریاکاری کو صدقے ہوتی

محبّتوں کا نقاب اُڑھاتی ہے ۔
مگر نقاب کے نیچے سے چہرہ
اب تو اور بھی صاف اور بھی واضح نظر آتا ہے
ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر
زوج بنتے ہیں ۔
نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے
ماتھوں پہ لکھی عزلتوں کی سیاہیاں دُھل تو نہیں جاتی ہیں
ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹّی
اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے ۔
تپے ہُوئے تنّور سے جس طرح پھُولی ہُوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں
میرے مُنہ پر طمانچہ مار کر
تمھارے ہاتھوں کی اُنگلیوں کے نشان
پھُولی ہُوئی روٹی کی طرح
میرے مُنہ پہ صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں
تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے ۔

ترا لُٹیا شہر بھنبھور

نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے
مَیں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمھیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے
تم میں بھی خواہش ہے
مجھ سے خوبصورت بنتے رہنے
اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں
لپٹے رہنے کی۔
کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے
روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی
روز، سہ پہر سے رات

قدموں کی چاپ کی بازیافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلّی کے حرف کی اُمید میں
بسر ہوتی، منتشر ہوتی رات، اور پھر دن
کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں
کی طرح گزُر جاتا ہے۔
سہ پہر سے رات
پھر وہی احساس
پھر وہی خواہش،
تالے میں چابی گھومتی ہے
مَیں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں،
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح،
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح،
مگر نیند نہیں آتی ہے

جاروب کش

دوسروں کی سیوا
پتھّروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن ، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنے لیے بھی تو جیو !
دیکھو کنوَل کا پھُول کیسے عالم
اور کیسے ماحول میں اپنی انا
اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصّے بھرے تحکّم کو مان کر

کھڑکی سے جھانک کر مُسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چُرا لیتی ہو!
تم کیوں پینتیس برس کی عمر کی ہو کر
خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو
کہ تمھیں اپنے شوہر کے زہر میں بُجھے
فقروں سے طلاق کی بُو آتی ہے
تم ماں ہونے کے ناتے
اپنے اندر کے بچّے کو
گوشت پوست کے بچّوں کی بھینٹ چڑھا کر
ماتا کا نام دیتی ہو!
جیسے کچّے رنگوں کے دھاگے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچّے رنگوں کے دھاگے ہیں
سب پتّھر ہیں

ان کے اُوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو، تو بھی لہو لہان
پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں!
میری بنّو!
سُورج مُکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈّی چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈّی
چٹخ گئی ہے

کلیئرنس سیل

سُنو! اے بانوئے گُفت آشنا نیا قصہ
نکل کے آئی ہے لیلیٰ حیا کے محل سے
سُنا ہے مسئلہ درپیش ہے چناو کا
ہو آبنوسی بدن، شاخسار باہیں ہوں
کُشادہ، پیاسی، طلبگار، بے وضو آنکھیں
وفائے شب کے قرینے سے آشنا آنکھیں
طلوعِ دستِ مسیحا کی شکل میں پلکیں
جُھکیں تو سایۂ ابرِ سیاہ، یاد آئے
مہکتے ہار چمکتی گداز باہوں کے
نثار ہوں نئے مہماں کی دلنوازی کے

عروسِ وصل کو فردوس آشنا کر دیں
زباں میں ذائقۂ وصل یوں رچے شب بھر
کہ ختم ہو نہ یہ قربت کی ساعتوں کی سحر
بدن کے روپ میں، مَے کی صراحیوں کی طرح
خمارِ شب میں ڈھلیں اور بھی گلاب بنیں
زر و جواہر و لعل و گہر کا عرق پئیں
نصیب جاگیں گے دوشیزگانِ نورس کے
نئی سحر کے پیمبر جگا رہے ہیں انھیں
چلی بھی آؤ، بُلاتے ہیں ظلِّ سُبحانی!

تم سے !

اتنی گرمی

میرا تن اندر سے بھٹی

باہر ۱۱۷ ، ۱۲۰ کی گرمی

مہندی ، لمحے بھر کو ٹھنڈک

بیچ ہتھیلی آن جگائے

پانی پنڈے پر ڈالو تو

آتی جاتی ٹھنڈک

رُوئیں رُوئیں میں

ٹھہر ٹھہر کے چین سجائے

ٹھنڈے پیٹ اور نرم کٹوروں

بیچ رکھے ہاتھوں میں جاگے
دُھوپ میں جیسے گیلے کپڑے
رات میں جیسے خواب کا نشّہ
پھیلے پھیلے اور بھی پھیلے
اُن چھُوٹی کلیوں کی دُودھ سفیدی
جاگتی ، بند ہوتی آنکھوں کی صُورت
پھُول میں ڈھلنے کو تڑپے تو
فاختہ جیسے بازو کھولو
انگڑائی کی گرمی تم سے نئی چنبیلی مانگ رہی ہے

رات آتی ہے

دو بستر
ایک ہی کمرے ایک چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر
ایک پہ بے خوابی کا صحرا
ایک پہ نرم ہَوا کے جھونکے
ایک پہ لُو سے گرم تھپیڑے

دو بستر
ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل
ایک پہ شکنیں، امڈے دریا جیسی
ایک پہ خواب کی دیوالی اور دہکے ہونٹ

ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ

دو بستر
ایک پہ کروٹ ، دریا ملے سمندر میں
ایک پہ کروٹ ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں

دو بستر
بیچ نہ ساحل
اور نہ صحرا
پھر بھی ڈُونگا لمبا پَینڈا ۔

چوبِ خشک اور آگ

مرے عجز کو میرے خُدا کے سوا بھلا جانے کون
مرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون
بھلا جانے کون تجھے اور مجھے
پہچانے کون تجھے اور مجھے
پہچان کی منزل کوئی نہیں
کوئی سب کچُھ جان کے انجانا
کوئی سب کچُھ دیکھ کے بیگانہ۔
جسموں کی ہیئت تو سب کی ایک سی ہے
اندر بھلا کس نے جھانکا ہے
اندر تو گھور اندھیرا ہے

ہاں سب کا باہر ایک سا ہے۔
ذرا جھانکو تو
جسموں کے دریچے دیکھو تو
آنکھوں کی پلکیں ایک سی ہیں
آنکھوں کے ڈورے ایک نہیں
بانہیں تو سب کی ایک سی ہیں
بانہوں کا جھولنا ایک نہیں
ہاتھوں کی گرمی ایک نہیں
باتوں کی نرمی ایک نہیں
کبھی تم نے تلوے دیکھے ہیں
کچھ تلوے چاند کے ٹکڑے سے
کچھ تلوے کنکر ذرّے سے
کچھ ہاتھ ملائم رُوئی سے
کچھ ہاتھ دلدر مٹّی سے
پر دیکھے کون اِسے، پہچانے کون
مرے شوق کو، میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون!

شادی کی بیسویں سالگرہ

کہتے ہیں لمحے بیتے تو رنگ، مہک مر جاتے ہیں
کہتے ہیں دیوار گرے تو نقشِ گزشتہ مٹتے ہیں

ہم نے تپتی رات بھی پہنی
چڑھتے دن سا رُوپ سہا
شہد سا عشق الاؤ پہنا
برف سا قہر اور ظُلم پیا
ہم نے ہجر کی تاویلوں میں
خوابِ رفاقت راکھ کیے
ہم نے رزق کی زنجیروں میں
شب افسانے گوندھ دیے

میرے ساتھ کھڑے ہیں آج

تیری عمر کے بیس برس

زخم کے آتش دانوں میں

کیوں راکھ بھری ان برسوں کی

کیوں زعم رفاقت ریت بنا

کیوں چاند میں تیرتی مچھلی کا

خواب ہے اب تک خواہش جاں

کیوں سُوکھے پتّوں کے گھر میں

بیتاب ہُوا ہے شعلۂ جاں

مرے چہرے پہ تری خوکندہ

مرے دل میں کاغذ کی چڑیا

مرے گھر پہ غم کے ورق لگے

مرے بالوں میں چاندی دریا

مَیں بیس برس کی لہروں میں

کیوں ڈوب گئی ۔ کیوں ڈوب گئی

FATHER COMPLEX

تمھارے گہرے گھنے چمکتے سفید بالوں میں

میری خواہش کی چاندنی کی اُداس صُبحیں

گداز پائیں

مَیں رُوٹھ جاؤں تو وہ منائیں

مَیں جانکنی کا نقاب اوڑھوں

تو دِل میں جھانکیں

مُجھے مٹائیں

یہ تیرے بالوں کی صُبحِ سادہ

مجھے سکھائے

سفید بادل، زمیں کی پیاسی زباں کی

حدّت مٹا نہ پائیں

تمھاری پیاسوں کی شانت شامیں
جُھلس نہ جائیں۔
مرے لیے شرطِ جاں عجب ہے
پلٹ کے دیکھوں
تو آگ رونق بنی ہوئی ہے
جو آگے جاؤں
تو بادلوں سے نکلتا سُورج
پتہ نہ دے گا
وہ آسماں جو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں سے
ہمارے حصّے کا جھانکتا ہے
یہ پوچھتا ہے
تمھاری قسمت کے چاند گھٹنے کے دن
کبھی ختم ہوں تو سوچو
زمیں کی کروٹ میں
زندگی کی خمیدہ دیوار
گِر نہ جائے۔

پہلی برسی پر

عدم آباد کی مٹّی سے سجاؤ

یہ در و بام

کہ مَیں نے غمِ ہستی سے

تعلّق کی گزرگاہ کی

سب حاشیہ آرائی

تہذیب کی وادی سے پرے

درد کے پُر ہول دھندلکوں کی

سبک سیریِٔ موہوم کی یلغار سے آگے

کسی انجانے سفر کو رہِ مقصود بنایا،

تمھیں یہ رُخ بھی دکھایا!

کہ مجھے یاد ہے

مَیں نے ہی کہا تھا ،

تمھیں تصویرِ تمنّا کا ہر اِک رنگ دکھاؤں گا

ذرا سوچو تو

یہ بھی تو سیریٔ ہستی کا تماشہ ہے

کہ مَیں رنگ سے محروم ہوں

اور پھول ، ہر اک رنگ کے بکھرے ہیں

مری قبر ، مری شامِ تعلّق کے قریں

مانگ میں صبح کی تحریر سجاتے ہوئے

یہ ذہن میں رکھنا

کہ تمھیں دیکھتے رہنے کی تمنّا لیے

اِک شخص

تعلّق کی گزرگاہ کی خواہش میں ہے

اب خاک بسر۔

اے کاتبِ تقدیر، لکھ!

میری جیسی ماں نے جنی تھی

ہیر کہ جس نے زہر پیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

قرۃ العین جو کہلائی

جس نے علم کے سوکھے پیالے کو تن زیب کیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

میرا بائی متواری

جس کے عشق کی گہری پیاس کو

پیمانوں نے لوٹ لیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

نور جہاں، غم دیوانی
جس کے مزار پہ پھول نہ پتّی
جس نے فراق کا زخم سہا،
میری جیسی ماں نے جنی تھی

قوسِ قزح سی قلوپطرہ
جس کے درد کو لذّت کہہ کے
جب چاہا مطعون کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

نُوری، سسّی اور سوہنی
اپنا آپ مٹا کے جنھوں نے
شہرِ وفا آباد کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

لمبی کھجور سی شہزادی
جس کو تیغ کی آنچ نے جُھلسا
جس نے جیون وار دیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

مجھ جیسی بھی کوکھ جلی
قطرہ قطرہ زندہ رہ کر
جس نے موت کو مار دیا

مَیں کون ہُوں

موزے بیچتی جُوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم دیوار میں چُن کے
مثلِ صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتّھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں رسم و رواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں گود سے جس کی پھُول چُننے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھُول کی خوشبو چھُپ نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے
مجُھ کو خریدا مجُھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچے گھڑے پر تیر کے سوہنی مر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اُتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے قوم اُبھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا ، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی

اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے

پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

کہتے ہیں مَیں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں

خواہش میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
مَیں کانٹوں کے ہار پروتی رہتی ہوں

گرمی کی بیکار دوپہروں میں اکثر
جلتی ہوئی زمین کی دھڑکن سُنتی ہوں

جب میرا چلنے کو جی نہیں چاہتا ہے
پاؤں کی دیوار بنا کے بیٹھتی ہوں

کھال پرانی ہاتھ سے گرتی رہتی ہے
بات پرانی پیٹ میں پالتی رہتی ہوں

دیکھ کے باہر منظر نئے بُلاوے کا
مَیں کھڑکی کو اینٹوں سے چُن دیتی ہوں

فاختہ بن کے اُڑنے کو جی چاہتا ہے
پَر آ جائیں تو گھر میں چھُپ جاتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہَوا سے لڑتی ہوں

اپنا نام بھی اب تو بھُول گئی ناہید
کوئی پُکارے تو حیرت سے تکتی ہوں

آغوشِ طلب کا باب سوچوں
مَیں تیرے لیے وہ خواب سوچوں

جاگوں بن کے پلک پلک لب
شبنم کے بدن کی آب سوچوں

شامل ہوں مَیں تیرے رتجگوں میں
جاگوں بھی تو تیرے خواب سوچوں

تُو جائے تو منتظر ہوں تیری
تُو آئے تو بے حساب سوچوں

مَیں ریزہ ریزہ بکھر نہ جاؤں
کھولوں جو بندِ نقاب سوچوں

دیکھوں نہ مَیں آئینہ اکیلے
سانسوں میں بھی ہم رکاب سوچوں

بے تابیٔ جاں میں گھُل نہ جاؤں
صد پارۂ دل کی تاب سوچوں

بانہوں کے سمندروں میں اُتروں
آنکھوں میں لکھی کتاب سوچوں

جنگل ہے طلب کا اور مَیں ہُوں
کانٹوں میں چھُپا گُلاب سوچوں

شیشے کی فصیل میں مقیّد
امکاں سے سوا عذاب سوچوں

پہن کے زخم کا ملبوس، اپنے گھر جانا
سمیٹ لو کہ ہے پھر شام کو بکھر جانا

ملی نہ لاش زمیں اور پانیوں میں کہیں
اسے ہی سارے زمانے سے خوش خبر جانا

پرندے سارے اُڑے جا رہے ہیں کس جانب
تمھیں خبر ہو تو دریا کے پار، اُتر جانا

وہ جس کی آنکھ میں سچ اور زباں پہ جھوٹ بھی ہے
وہ پاس آئے تو آنکھوں ہی میں اُتر جانا

لرز رہی ہے زمیں، سہمی لڑکیوں کی طرح
پُکارتی ہے کہ تنہا نہ چھوڑ کر جانا

بندھے ہیں پیٹ سے بچّے بھی اور پیلے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

وہ جس کا شوق ہے کِھلتے گلاب کُل دینا
گلے ملو تو اسے بھی اُداس کر جانا

میری ضرورت ہے تُو ، تیری ضرورت ہوں مَیں
کوچۂ پندار میں حرفِ ملامت ہوں مَیں

ناؤ کی صُورت چلوں موجِ ہَوا پہ جیوں
ساحلِ غم ڈوب جا داورِ قسمت ہوں مَیں

جاگتی آنکھوں میں بھی خواب سجاؤں ترے
رنگ لکھوں لمس کے قریۂ خلوت ہوں مَیں

جاؤں کہاں ڈھونڈنے تیری صدا کا بدن
تیری گواہی ہوں مَیں، تیری صداقت ہوں مَیں

جاگتے رہنا تو اب جیسے مقدر ہوا
وہ بھی تو ہے جاگتا اس کی ہی عادت ہوں مَیں

عمر کی خوشبو سے تھے دل کے بھی تیور جُدا
شام کی دھوپوں میں اب زہر کی رنگت ہوں مَیں

آگے سرک رہے ہیں کہ سکتہ بھی ہے عجب
دیوار و دَر کو شوقِ تماشہ بھی ہے عجب

روزن ہیں اس قدر کہ توجہ محال ہے
صحرا میں تشنگی کا حوالہ بھی ہے عجب

شاید اداس شاخوں سے لپٹا ہُوا ملے
اپنی گلی میں اس کا ٹھکانہ بھی ہے عجب

گنجان گہرے سبز درختوں نے بانٹ لی
وہ تیرگی کہ جس کا اُجالا بھی ہے عجب

دیوار و دَر کے رنگ ہیں آنکھوں پہ جم گئے
دہشت سے مر نہ جائیں کہ رستہ بھی ہے عجب

بکھرے حرُوف جوڑ کے لکھ دو کوئی تو نام
اس دل کے دُکھ عجب ہیں مسیحا بھی ہے عجب

مَردوں کو سب روا ہے یہ ہے عورت کو ناروا
شرم و حیا کا شہر میں یہ چرچا بھی ہے عجب

حرفِ وصال، حرفِ گماں تک نہ بن سکا
تہذیبِ جاں میں غم کا مداوا بھی ہے عجب

بھیجی ہیں اُس نے پھُولوں میں مُنہ بند سیپیاں
انکار بھی عجب ہے، بُلاوا بھی ہے عجب

ہنستے رہے ہم اُداس ہو کر
آنسو بھی گرے تو دل کے اندر

قبروں کو بھی بنانا سیکھیں
بالوں میں نئی رُتیں سجا کر

مَیں گھر میں بھی اس سے مِلتی کیسے
دیوار کھڑی تھی گھر کے اندر

مِٹ جائے بدن کا جاں سے رشتہ
آئیں گے خطوط پھر بھی گھر پر

دیکھا تو زمیں کھسک رہی تھی
بیٹھے تھے بنا کے گھر زمیں پر

پانی کا بہاؤ تھم گیا ہے
نکلی ہے ندی سے وہ نہا کر

اب صرف لباس رہ گیا ہے
وہ لے گیا کل بدن چرا کر

سحر نے شب سے ملاقات میرے گھر کی تھی
اسے بے خبر یہ نشانی تو پھر سفر کی تھی

یہ کیسی ضد کہ پلٹتی ہے لہر ساحل پہ
یہ حوصلے کی نمو تھی ، کہ بات ڈر کی تھی

اُفق اُفق جو تمنّا کا چاند بن کے چڑھا
اُسی نے خواب کی دہلیز معتبر کی تھی

سمجھ لیا کہ بہت دے دیا زمیں کا خراج
زمیں نہ تھی ، تو یہ نیّت بھی ، راہبر کی تھی

وُہ کھینچ لایا شجر کا گُداز آنکھوں میں
گلے مِلا تو وہی چھاؤں مختصر کی تھی

پتہ نہ دے وہ مرے پاس دُور رہنے کا
وُہ چُپ رہا تو یہ تصویر بھی خبر کی تھی

ہلال تھا کہ خمِ خواب تھا، نہیں معلوم
خبر یہ ہے کہ دُعا اُس کو دیکھ کر کی تھی

سمیٹ لو کہ یہی منظروں کا حاصل ہے
اُس ایک آنکھ میں تصویر پورے گھر کی تھی

یہ کیا خواب تمہارے نکلے اور عذاب ہمارے
چھلکی چھلکی آنکھیں لیکن دل پایاب ہمارے

یہ کیا شہر کے پھول بھی پوچھیں، رنگِ بہار کی خصلت
یہ کیا خُون ہمارا پہنیں خود احباب ہمارے

یہ کیا آدھے چاند پہ رونق، آدھے پہ تاریکی
یہ کیا، صُبحِ تمنّا ان کی، شب القاب ہمارے

یہ کیا بہتے دریا آنکھیں، جلتے صحرا پاؤں
یہ کیا بُجھ گئے اب کے دلوں میں بھی مہتاب ہمارے

یہ کیا تجھ سے پُوچھ کے اب مَیں اپنا حال بتاؤں
یہ کیا اپنا رزق بھی تیرا اور سیلاب ہمارے

یہ کیا جن کو دیکھنا چاہیں اور نہ دیکھیں ان کو
یہ کیا آنکھیں بھُول نہ پائیں، شب آداب ہمارے

یہ کیا مہر و محبّت نکلیں ، قصہ ِ دیار کے قصّے
یہ کیا آنکھ جو دیکھے اس پہ لب غرقاب ہمارے

یہ کیا کھینچ لی پاؤں تلے سے ریت بھی دریا نے
یہ کیا منزل پُوچھ رہی ہے ہم سے خواب ہمارے

میرا آنگن ، میری کھیتی ، مجُھ کم ذات سی اکثّر
تم زندہ کہ ٹوٹ کے بکھریں کب اعصاب ہمارے

شہر میں دیواریں تھیں اور دیواروں میں وہ تنہا تھا
خبر نہیں وہ شخص تھا کیسا، چہرہ اُس کا اچّھا تھا

پہچانا تھا دستک کو اور قدموں کی ہر آہٹ کو
بُجھے چراغ کو ہاتھ میں تھامے، دروازہ بھی کھولا تھا

گھر میں تھے بس سانس مرے اور خواب دھرے تھے طاقوں پر
اُس نے گیلے فرش پہ ٹھنڈے پیر گھما کے سوچا تھا

خواہش بھر کے پچکاری میں، من ہم لی کب کھیلو گے
کُنڈی دروازے کی کُھلی تھی، چھت پہ دِیا بھی رکھّا تھا

مہندی پیڑ تو سوکن گھر تھا، اُس گھر ہی دیوالی تھی
میرا گھر جیسے بالک کا ٹوٹا ہُوا کھلونا تھا

پچھلے برس کے خواب تواب کے چوک میں بھی نیلام نہ ہوں
لوگ بسیں اس گھاٹ جہاں سے کل وہ دریا بہتا تھا

عمر میں اُس سے بڑی تھی لیکن پہلے ٹوٹ کے بکھری میں
ساحل ساحل جذبے تھے اور دریا دریا پہنچی میں

شہر میں اُس کے نام کے جتنے شخص تھے سب ہی اچھے تھے
صبحِ سفر تو دُھند بہت تھی، دُھوپیں بن کر نکلی میں

اُس کی ہتھیلی کے دامن میں سارے موسم سمٹے تھے
اُس کے ہاتھ میں جا گی میں اور اُس کے ہاتھ سے اُجلی میں

اِک مُٹھی تاریکی میں تھا اِک مُٹھی سے بڑھ کر پیار
لمس کے جگنو پلّو باندھے زینہ زینہ اُتری میں

اُس کے آنگن میں کُھلتا تھا شہرِ مراد کا دروازہ
کُنوئیں کے پاس سے خالی گاگر ہاتھ میں لے کر پلٹی مَیں

مَیں نے جو سوچا تھا یوں تو اُس نے بھی وہی سوچا تھا
دن نکلا تو وہ بھی نہیں تھا اور موجود نہیں تھی مَیں

لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی، قطرہ قطرہ شب ہو گی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے، اپنے آپ ہی سنبھلی مَیں

اسیں بُریاں وے لوکو!

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، میں اور میں
حفظ ، حفاظت دروازہ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
گھر اُجڑے اور شہر آباد
یاد کسی کو نہ اپنا نام
کاغذ جیسی دُلہنیں
ردّی بن کر بک جائیں

داسی ، ملکہ ، گھر رونق
فرنی پہ چاندی کے ورق
پانی ، بھوک ، جلن خواہش
فردِ جُرم کی خوں بارش
دشتِ بدن کی سیّاحی
خوابِ شفق کی جرّاحی

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، میں اور میں
پیٹ سے سب کے اُبلے آگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
دِل دروازہ
قلم سے جھٹکی سیاہی نشانی
کنگھی ، ٹوٹے بال ، کمائی

جھُوٹی روٹی ، شُکر خدایا
جیوے سائیں ، کیا سُکھ پایا
مٹّی گارا اور اینٹیں
سب ہیں جھُوٹی بُنیادیں
مٹّی کے سینے پہ مٹّی
مٹّی چاٹے بالک
مٹّی کھائے حاملہ
مٹّی آنکھ دِکھائے
مٹّی ذائقہ اور زبان
زبان، جپے تیرا نام
حرف کے سو بَن باس
بول بھی دُشمن
چُپ بھی دُشمن
چلو کہارو، ساجن آنگن
مَوت کے بعد ہی واپس آؤ
چلو کہارو !

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
دیواروں پہ ناچے کاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
خمیازہ
شہر شگفتہ ، گھر نمناک
دل کیا ہیں زخموں کے چاک
نفرت کے سب انگارے
سیپارے
گھر والی ، من دیوانی
آگ لگے ، کہے دیوالی
فن پیاسی ، گھر کی داسی
حسبِ اجازت ، کامنا
پانی کو بھی چھاننا

کمر، کنستر، جلتا گوشت
پھول کِھلے اور نکلے پوست
دن دوزخ اور شب شیطان
آدم خور رہیں انسان

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں
پور پور میں دیپک راگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل کا غازہ
کنٹھی، جامنی، گیروے
رشتے، بھونرے اور منکے
مکھّن اور لوبان کی بتّی
ہرنی آنکھیں کستوری

زعفران کے سُوکھے پھُول
گردن جھٹکو کہو قبول
محل ، اُداسی ، بیراگی
مَل آنکھیں ، تُو ہے جاگی
سُن سناٹا رگوں کا
جاگا ہے دھن گھروں کا
دریا کی تہہ میں بستی
سنگ بھی دریا کے بستی
نیزہ جیون کا لگے
ساگر ساگر یہ کہے
سُوئی ، ناکا اور دھاگا
یہ ہے جیون پو بارہ

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں

آنکھوں میں سپنوں کے بھاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل شیرازہ
مٹّی نے پہنی سُرخی
سوئی خلقت ہے جاگی
کانچ کلائی کجروا
موتی ، نین بجروا
غوطہ اونچی لہر میں
گُڑ میٹھا ہے زہر میں
گیان دھیان کے سب استھان
بن جاتے ہیں سب انجان
گھاس ، زمین ، زمین بھی گھاس
انگلی انگلی ، سو سو پھانس
پَوَن جھکورا ، خواب کا
باب کھُلا سنجاب کا

فـرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
لال سندوری چمکے مانگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
شب اندازہ
عُمر کی کُنڈی
کھولے کھڑکی
برف ، ہَوا ، بارش ، طوفان
جاگیں ڈر ڈر کے انسان
رشتہ ، روئی
جذبے ، چرخی
کاتو پُونی
پُونی کاتو
کپڑا ، چادر ، بہلاوا

چھُپ کے مِلنے کا رستہ

رزق ، دُعا ، دیوارِ شجر

ہنسلی ، پھندا ، ڈر ، گھر گھر

بھٹّی ، بھُرتا ، بھاونا

شیشے میں یوں اُتارنا

شیر بھی گھاس کو کھا جائے

آگ پہ چل کے خود آئے

دُودھ سفیدی سے عاری

خوف سے چہرے پچکاری

فرد ، اکائی ، اکلاپا

لہر ، دریا ، سمندر ، لہر

پانی ، مَیں اور مَیں

سیج بنے پھولوں کی آگ

باہر بیٹھا کالا ناگ

اندر موت کا آوازہ

گھر شب غازہ

صاحب بی بی اور غلام
سب کے دام
بی بی ، غلام
بس ایک سے کام
شیلف ، سجاوٹ ، دوپہر
شام کو آتشدان میں آگ
چہرے لال ، بہت ہی لال
گھونگھٹ پٹ کھُلے اور در بند
ناچے خون کا انگارا
گاتا جائے بنجارا
مذہب ، دُنیا اور اللہ
جیون کی یہ دُر گھٹنا
بات میں شب کا ذائقہ
ہُنر میں زہر کا قاصدا

توتے میں جیون رُوپا
جنگل میں ڈھونڈے دیوتا
حق اللہ توتے کی رَٹ
کنوئیں پہ چلتا رہے رہٹ
انجن دُھواں نکالے جائے
بادل ہَوا ، اُڑائے جائے
بند ، بندھے کِس کنارے
پار اب کون اُتارے

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
خواب سگئے آنکھوں میں جاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
لب ہیں تازہ
شبنم ، شاخ ، شجر ، سمن

مہندی ہاتھ اور پھول لگن
دِل کا حال کبوتر سا
کوندا مارے جی ڈر کا
نرگس سی اُس کی مرضی
دُنیا پھیلے وہ سمٹی
لشکر، لشکر وہ بجنے
پیاسی دریا سی رہے
خیمۂ جاں، دھجّی دھجّی
شیشۂ دِل، کرچی کرچی
نخلِ تمنّا، برگِ خزاں
وصل کا لمحہ، وہم و گماں
قند تو کیا گلقند بھی زہر
ایک ہیں اب تو جنگل شہر
دیکھ کے زرد ہو زعفران
آنکھوں کو بھولی پہچان

اوس سے پیاس بجھے گی کب
جاگے گی شب مجرئی کب

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
چاہے دیجو سُکھ بھی تیاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
غم خمیازہ
کالی پکی جامنیں
لگے ہیں لڑکیاں رات میں
بانس کے جنگل جوانیاں
کچّا ، کٹورا کہانیاں
میٹھے آڑو کے غنچے
دِل میں کوندا سا لپکے

آلوچے کے پھول بھی پیازی
سندر لاگے آتش بازی
کالی بیل کے کالے پھول
آنکھیں، ہاتھ، تمنّا، دھول
عورت جب جل جائے ہے
کڑوا کٹھل بن جائے ہے
سورج سے لکھّے بپتا
پانی سے ڈھونڈے رشتہ
دکھ سے بُنے خیالوں کو
خود ہی تانے جالوں کو
نالی میں خوں کا چھینٹا
پنکھے سے لٹکا پھندا
پانی پہ ٹھہری کائی
خاموشی ہے سچّائی
خواہش کرتے کمر جھکی
زینہ زینہ جاں نکلی

پیر دباتے شب گزرے
گھونسے کھاتے دن بیتے
فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر، دریا ،سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
گائے دِل اب یہ بیراگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دل غم سازہ
کلموہی اور نصیبوں جلی
سُنتے سُنتے گھر میں پلی
ڈر ڈر دیکھا بدن کو
گندا سمجھا لگن کو
بن بر دیکھے بیاہی گئی
مَیں سوچوں مَیں چاہی گئی

چمڑی ، پیچ بنے چاہت
لوگ کہیں ہیں دسراہت

گھر کایا دیواروں سے
بات کروں انگاروں سے

پتّھر پیٹ بجنے نکلے
ساتھی بھی سائے نکلے

لینے سفیدی بالوں کی
صحرا شرط ، غزالوں کی

خود کلامی

مجھے سزا دو
کہ مَیں نے اپنے لہُو سے تعبیرِ خواب لکھی
جنُوں بریدہ کتاب لکھی
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے تقدیسِ خوابِ فردا میں جاں گزاری
بہ لطفِ شب زادگاں گزاری
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے قاتل کو وصفِ تیغ و عَلم سکھایا
سروں کو اوجِ قلم سکھایا
مجھے سزا دو

کہ مَیں عدُو کی صلیب کی محتسب رہی ہوں
ہَوا کی زد پہ جلے چراغوں کی روشنی ہوں

مجھے سزا دو

کہ مَیں نے دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دی تھی
گھروں کے بجھتے دِیوں کو شانِ خدائی دی تھی

مجھے سزا دو

کہ مَیں جیوں تو تمہاری دستار گر نہ جائے

مجھے سزا دو

کہ میرے بیٹوں کے ہاتھ اُٹھے تو تم نہ ہو گے
کہ ایک بھی تیغِ حرف قوسِ میاں سے نکلے تو تم نہ ہو گے

مجھے سزا دو

کہ مَیں تو ہر سانس میں نئی زندگی کی خُوگر
حیات و بعدِ حیات بھی زندہ تر رہوں گی

مجھے سزا دو

کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہو گی

تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت

بولنا ہماری ضرورت ہے
چاہے زمین میں مُنہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے ۔
میری بے گنہی زمین میں منہ دے کر
اپنی صفائی پیش کر رہی ہے
کہ زندگی کے سارے راستوں پر
قاضیٔ شہر کے فیصلے کے مطابق
خوف بچھایا جا چکا ہے ۔
بولنے والے ہمارے شہر میں کتنے رہ گئے ہیں
ان کے سر کاٹ کر واقعی سجا لینے چاہئیں
کہ پھر دیکھنے کو بھی ایسے لوگ نہیں ملیں گے

خُدا کی قسم

میری آنکھوں کی جگہ آبلے بھی لے لیں

تو بھی مَیں گریہ کروں گی

کہ میرے کھیتوں میں چیخیں اُگ رہی ہیں

میرے آنگنوں میں ٹھہری خاموشی

میرے بچّوں کی ہنسی لوٹ رہی ہے

میرا چپراسی وردی پہننے سے انکار کرتا ہے

کہ وردیاں تیسرے درجے کے شہری کی علامت بن چُکی ہیں۔

بات تو علامت سے بھی آگے نکل چکی ہے

چھپکلی کی کٹی دُم کی علامت ہو کہ

بُو ئے خوں کی علامت

اب سب خوف کے دوسرے نام ہیں

ہم لوگوں کو اپنے ہی وطن میں جلا وطن کر دیا گیا ہے

کہ ہم بے رُوح جاندار، قصدِ گویائی سے بھی منحرف ہیں

"نائٹ میئر"

بکری ، ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے
اور مَیں صُبح ہونے کا ۔
کہ مَیں روز دفتر کی میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھُوٹ بولنے کے لیے
یہی میری قیمت ہے ۔
تازہ قبروں کی طرح ، پاوڈر سے لپے ہُوئے چہرے
مجھے ملنے آتے ہیں
ذہنوں کے قبرستان میں ایسی سجاوٹیں ہی
زیب دیتی ہیں
مَیں اور میرا وطن ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے

مگر دونوں کی بصارت بچپن ہی میں ماری گئی۔

مَیں نے روٹی دیکھی نہیں

اپنے تصوّر میں اس کی شکل بناتی اور کھاتی ہوں

میرے بہت سے ہم عمر، روٹی صرف خواب میں دیکھتے ہیں۔

میرے مُلک میں عورتیں پہلی کا چاند دیکھ کر دُعائیں مانگتی ہیں

اور باقی ساری دُعائیں اگلی پہلی کے لیے اُٹھا رکھتی ہیں۔

دوسری شادی کے اجازت نامے پہ انگوٹھا لگانے کے بعد بھی

وہ پہلی کا چاند دیکھ کر دُعائیں مانگتی رہتی ہیں،

شاید ہم جیسے جھُوٹ بولنے والوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے۔

ہم اپنی جنگجُویانہ بہادری کے گُن گاتے ہیں

اور مکھّیاں ہم پر یلغار کرتی رہتی ہیں۔

ہم اپنے قد سے لمبی تلوار کو اسلاف مانتے ہیں

اور ان کا زنگ اپنی زبانوں پر سجا لیتے ہیں

زنگ خوردہ زبانوں اور زمانوں میں زندگی کرنے والوں کا نام

دفتری بابُو ہوتا ہے۔

جانے والے کا ہر حساب غلط

اور آنے والے کا ہر حساب درست
زنگ خوردہ زبانیں ہی کہہ سکتی ہیں
اب تو تلوار بنانے والا آہن گر، یہ سمجھتا ہے
کہ فتح، وہ تحریر کرتا ہے

پرسونا I

آسمان کے بوڑھے ستارے
اور پہاڑ کی چوٹیوں پہ کھڑے
درختوں کے بے امان تنے
صدیوں کا صبر اپنے سینے میں دبائے
مُنہ بند تنوّر کی طرح
بے زبان سے نظر آتے ہیں
جس لکڑی سے کشتی بنتی ہے
اس کو پانی پسند نہیں
مگر ساتھ رہنے کے لیے
پسند کا مسئلہ ثانوی ہو جاتا ہے۔

مرے بغیر، مُردوں کی طرح زندگی گزارنے کا عمل
تمہارے جُوتوں کے پنجوں کی اُڑی کھال پہ
پڑی گرد سے ظاہر ہوتا ہے۔
انگیوں کے سہارے ڈھلکی چھاتیوں کو
رُوپ نہیں مِلتا ہے۔
کُند چھُری اور بیٹھی مٹی جیسے
نمی خوردہ بدن پہ
بُزدلی کی نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں۔
دو ترچھی لائنوں کا اتّصالی نقطہ
مبہم رشتوں کو منطقی ثابت کرنے کا
مجہولی عمل۔
وہ پروٹیکٹر بنا
اتّصالی نقطے کے گرد حصار کھینچتا رہا
اور مرے وجود سے انکار کی لائن گہری ہوتی چلی گئی۔
غار اور قبر میں کیا فرق ہوتا ہے
ایک قدرتی اور ایک ارادی

ارادی منصوبے اپنا ماضی رکھتے ہیں
اور مستقبل بھی۔
تنہائی سیلن کی طرح
مرے وجود کے اندر سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔
مَیں کیا دھند میں پیدا ہوئی تھی
کہ میرے اندر ہر عکس، ہر رشتہ
اور ہر جذبہ دھندلا ہے۔
جیل کے قیدی نے کبھی رات کا آسمان نہیں دیکھا
اور سُورج نے کبھی رات نہیں دیکھی
مَیں نے دن نہیں دیکھا
مَیں نہ قیدی ہوں اور نہ سُورج
مَیں تو بچپن میں
بڑے بہن بھائیوں کے پُرانے کپڑے
پہنا کرتی تھی
اور تجربوں کی جُھرّیوں کے اِس زمانے میں
یادگار لمحوں کے سنبھالے ہوئے کپڑوں کو

تہوں سے اُڑی رنگتوں کے باوجود
کھول کھول کر پہن رہی ہوں
میری آنتوں کی رسّیاں بنا کر
اور جُھولا جُھولو
کہ مَیں نے اپنی زبان کا تنوّر
بند کر دیا ہے

پرسونا II

رشتوں کی آبجو میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی ہے
مگر پھر بھی سرنگوں جیسے رابطوں سے
آگے کی منزل کی تلاش میں
ہم ایک دوسرے کے لیے بے چین رہتے ہیں
مجھے معلوم ہے
بابوں کے جنگل میں ایک درخت کا نام
مرا باپ تھا
اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر
گزرتی ہواؤں کو دیکھو، تو سوچو
انہی میں سے کسی کا نام میری ماں تھا

کہ بغیر پتہ لکھے خط، بالکل ایک جیسے لگتے ہیں
مَیں ، اپنے سب سے سہانے خوابوں میں بھی
ایسے پتّھر پہ کھڑی نظر آتی ہوں
کہ جس کے نیچے میرا دل ہے ۔
میرے زخموں میں سے جھانک کر
خُدا دُنیا کو دیکھتا ہے
اس دُنیا کو کہ جہاں لوگ
کھڑے ہوتے ہیں تو کھانے کے لیے
اور بیٹھتے ہیں تو مرنے کے لیے ۔
تلخ لہجے میں کہے ہوئے شیریں لفظ
اور بھی تلخ ہو جاتے ہیں ۔
میرا جی کرتا ہے
مَیں وقت بن جاؤں
اور تم کائنات
یوں تو تم میرے ساتھ چلو گے
وقت سے پیچھے رہ جانے والوں کو

بہاریں نہیں ملتی ہیں۔
سوکھی گھاس کہ جسے کوئی بھی
چنگاری بھسم کر سکتی ہے
تمہارا آنگن کیوں بنے۔
آؤ بارش کا پہناوا پہنیں
شاید یونہی نکھر جائیں
مگر کیسے کہ ہم تو خواب میں بھی
خواب دیکھنے والوں جیسے نہیں ہوتے ہیں۔
مجھ جیسے وقت میں
اور تم جیسی کائنات میں تو
خاموشی بھی بولتی ہے۔
ہم کہاں جائیں کہ سنّاٹے کی گونج
ہمارے کڑھے ہوئے کرتوں کے نیچے
چھپے زخموں کو آشکارا کر رہی ہے
وہ سارے رنگ کہ جنہیں میں
خوابوں اور کھلی آنکھوں دیکھتی ہوں

میری مدد نہیں کر سکتے
میری آنکھیں بوڑھے وحشی درندے کی
آنکھوں کی طرح کھُلی بھی ہیں
تو کیا فرق پڑتا ہے۔
کسی شخص کی ہذیانی ہنسی کو
ایک سنجیدہ کُتّا، اسی طرح حیران ہو کر دیکھتا ہے۔

پورٹریٹ ۱۹۸۰

موسم بدلنے کی رُت میرے اندر نہیں آتی ہے
مَیں تو سمندر کی موجوں کے
پُرسکون ہو جانے کے وقت
ساحل کی سمت جاتی ہوں
شاید اس لیے آگ میری زبان کی ساتھی ہے
اور مَیں دوستوں کی رُخصتی کا نوحہ
ویسے تو، ہر نیا اندوہ، گزشتہ کی تجدید ہی کرتا ہے
مگر، پھر بھی نیا لگتا ہے
بالکل ایسے، جیسے اک نیا دوست!

اتنے مہین لمحے کہ جن کے آر پار

ایک سا دکھائی دے

تعلّق کی عمریں سنبھالے ہوتے ہیں

گلاب کا رنگ میرے چہرے پہ نہیں ٹھہرتا

اور میری زبان کی سُرخی

لال پنسل سے بنی لگتی ہے

کہ موسم بدلنے کی ُرُت' میرے اندر نہیں آتی ہے

سانپ کینچلی

ہمارے ملک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت ہے۔
ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے
کی اجازت نہیں۔
وہ شاید اسی لئے شادی کرتے ہیں۔
ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خون
اور آنکھوں کی لوؤں تک پھیلے جذبوں کو
شادی کا نام دیتے ہوئے
میری انگلی میں پھانس بہت چبھ رہی ہے۔
مجھے آسمان کا رنگ آنکھوں میں دیکھنے کی تمنا ہے
مجھے گلاب کا رنگ ہونٹ بنتے دیکھنے کی آرزو ہے

مجھے موج موج بدن کی بیچینیوں سے
مغلوب ہونے کی وحشت دیوانہ کیے ہوئے ہے۔
مگر ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے
دکھانے کی اجازت نہیں۔
اسی لیے تو آستین سے ناک صاف کرتے بچّے بھی
نالی پہ بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر باولوں کی طرح ہنستے ہیں۔
خواب دیکھتے ہوئے لڑکیاں ڈر جاتی ہیں
اور چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہیں۔
اور لڑکے شیطان کو کنکر مار مار کر بے حال ہو جاتے ہیں۔
ہمارے ملک میں بے شرمی کی ممانعت ہے
اسی لیے ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرتے دکھانے کی
اجازت نہیں۔

ساحل سے آگے صحرا

میرے بے زبان غموں کی چیخیں
میرے آنگن کی دُھوپ ہیں۔
میری سماعت کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں
مگر نہ کوئی اندر آتا ہے
نہ ان کو بند کرتا ہے
اور نہ ان پر دستک دیتا ہے
میری آنکھوں کی چوکھٹ پر
اکتائے ہوئے لمحوں کی سونی بارات
پلکوں سے یاقوت چنتی ہوئی
رگ رگ میں اُداسی اُتارتی ہوئی

سورج کے نکلنے کی سرخوشی سے انکار کرتی ہے
رات کی آسودگی کو خیمۂ غم سمجھتی ہے
اور یہ ماننے سے انکار کرتی ہے
کہ موت کے جنگل میں
کوئی چڑیا نہیں بولتی ہے
کوئی صبح
پلکوں کو جدائی کے راستے پہ لاکر
کھڑی نہیں کرتی ہے
یہاں فاصلے دوست
اور جدائیاں رفیق ہوتی ہیں
نہ روشنی راستہ دکھاتی ہے
نہ اندھیرا راستہ روکتا ہے
درختوں سے باتیں کرتی ہوائیں
وہاں کیا کرنے جاتی ہیں!
میرے کانوں میں تو اس کی آواز
سیپی میں بند موتی کی طرح محفوظ ہے
میرے بدن کی کروٹوں میں اس کی محبت
دلدل میں کھلے کنول کی طرح مسکراتی ہے
چھوٹے تالابوں کا پانی

خود اُن کی زمینیں پی جاتی ہیں
ننگے درختوں اور چٹیل چٹانوں پہ
بادل کے سائے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے!
اکیلے میں رونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے
رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں نے کھولی
البم میں لگی تصویروں میں پورا خاندان تھا
سب خوش تھے، ہنس رہے تھے
آج میری آواز خالی کمرے میں گونج رہی ہے

اُداسیوں کے چٹخنے کی آواز

موت ایک دروازہ ہے جو زندگی سے جلا وطنی کی سرزمین پہ کھلتا ہے
موت ایک روشنی ہے جو ہماری آنکھوں سے کشید کر کے مٹی میں بو دی
جاتی ہے
موت ایک چراغ ہے جو بارشوں میں جلتا ہے اور آندھیوں کو اپنا رزق
بناتا ہے
موت ایک آہٹ ہے جو دیکھی جا سکتی ہے، سنی نہیں جا سکتی۔
موت ایک عنوان ہے جو کتاب کے ہر ورق پر ہر نئے نام کے ساتھ ہویدا
ہوتا ہے
موت خامشی کا وہ لباس ہے جس میں کوئی تار نہیں کوئی گرہ نہیں

موت عاجزی کا وہ نوحہ ہے کہ جس میں لفظ بھی نقاب پہن لینا
چاہتے ہیں
موت رخصتی کا وہ منظر ہے کہ جہاں آسمان بھی اپنی لامکانی کو خاک
کر دیتا ہے
موت آگہی کا وہ لمحہ ہے کہ فراموش گاہوں میں پڑے دکھ بھی مسرّتوں
کے آشیانے معلوم دیتے ہیں

بھولنے کے لیے ایک لمحہ بھی گراں ہوتا ہے
یاد رکھنے کے لیے ایک عمر، ناکافی ہوتی ہے

بارش ہونے میں ابھی دیر ہے

محبّت، بنا دستک دیے
مہمان کی طرح آئی
اور اپنے تعارف کے لیے
میرے ساتھ بیٹھ گئی
سورج اُس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا
میں کہ جس نے
اندر کی گڑیا کے بازو، ٹانگیں اور سر
خود ہی الگ الگ کر کے پھینکا تھا
گڑیا کے منہ پہ بٹنوں سے بنی
چمکتی آنکھوں میں اب زندگی دیکھ کر

اندھیری رات میں ستاروں کی چھاؤں
کے گداز کو یاد کرنے لگی۔
مجھے اپنے اندر کی گڑیا کا چہرہ
اُس تراشے ہوئے بُت کے چہرے کی طرح لگا
جو اپنے ہی خدوخال کی تراش سے
اُڑی خاک میں اَٹا ہوا ہو
پیچھے پیچھے آتا ہوا سورج اب سر پر آگیا تھا
جہاں پُل نہ ہو
کشتی کشتی جوڑ کر پُل بنایا جاتا ہے
دریا پار کیا جاتا ہے
دریا اور کشتی کا رشتہ کتنا مضبوط ہے
مہمان کی طرح آنے والی محبت نے
مجھے سمجھایا!
اور مجھے ساتھ لے کر اُن زمینوں کی سمت آگئی
جہاں ہوا رنگ میں تحلیل تو ہو جاتی ہے
مگر بارش نہیں بنتی ہے۔
شاید کچھ اور محبّتیں، کچھ اور دستکیں
ہوا کو اور گرم اور شرابور کر سکیں۔

موم محل

میرے بیاہ سے پہلے میری ماں
خواب میں ڈر جایا کرتی تھی
اُس کی خوفناک چیخوں سے میری آنکھ کُھل جاتی تھی
میں اُسے جگاتی، ماجرا پوچھتی
اور وہ خالی آنکھوں گھورتی رہتی
اُسے خواب یاد نہیں رہتے تھے
ایک رات خواب میں ڈر کر
اس نے چیخ نہیں ماری
خوف زدہ ہو کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا
میں نے ماجرا پوچھا

تو اس نے آنکھیں کھول کر شکرانہ ادا کرتے ہوئے کہا
"میں نے خواب میں دیکھا تھا
تم ڈوب رہی ہو اور میں نے تمہیں بچانے کو دریا میں چھلانگ لگائی ہے"
اور اُس رات بجلی گرنے سے
ہماری بھینس اور میرا منگیتر جل گئے تھے۔
ایک رات ماں سو رہی تھی اور میں جاگ رہی تھی
ماں بار بار مٹھی بند کرتی اور کھولتی
اور یوں لگتا کہ جیسے کچھ پکڑنے کی کوشش میں تھک کر
مگر پھر ہمّت باندھنے کو مٹھی بند کرتی ہے
میں نے ماں کو جگایا
مگر ماں نے مجھے خواب بتانے سے انکار کر دیا
اُس دن سے میری نیند اُڑ گئی
میں دوسرے صحن میں آ گئی
اب میں اور میری ماں دونوں خواب میں چیخیں مارتے ہیں
اور جب کوئی پوچھے
تو کہہ دیتے ہیں
ہمیں خواب یاد نہیں رہتے۔

سرد ملکوں کے آقاؤں کے نام

میرا ملک گرم ہے
میرے ہاتھوں کی تپش کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
میرے پیروں کے جلنے کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
میرے بدن پہ آبلوں کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
میرے گھر کی چھت پگھل کر گر جانے کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
میری دیواروں کے جھلسا دینے کے رویے کا سبب شاید یہی ہے

میرا ملک گرم ہے
میرے بچّوں کے پیاسے رکھے جانے کا سبب شاید یہی ہے۔
میرا ملک گرم ہے
میرے بے لباس رکھے جانے کا سبب شاید یہی ہے
میرا ملک گرم ہے
شاید اسی لیے نہ برستے بادلوں کے آنے کا پتہ چلتا ہے
اور نہ سیلابوں کے گذر جانے کا
کہ میری فصلوں کے اجاڑنے کو
کبھی مہاجن، کبھی جنگلی جانور، کبھی آفتیں
اور کبھی خود ساختہ آقا آن دھمکتے ہیں
مجھے اپنے گرم ملک سے نفرت کرنا مت سکھاؤ
مجھے ان آنگنوں میں اپنے گیلے کپڑے سکھانے دو
مجھے اس کے کھلیانوں میں سونا اُگانے دو
مجھے اس کے دریاؤں سے پیاس بجھانے دو
مجھے اس کے درختوں کی چھاؤں میں سانس لینے دو
مجھے اس کی دھول کو پہننے اور مسافتوں کو اوڑھنے دو
مجھے لمبے ہوتے سایوں کی چھاؤں نہیں چاہیے
مجھے تو نکلتے سورج کی شعاعوں کی حمایت حاصل ہے
سورج اپنی توانائی میرے ملک میں ارزاں کرتا ہے

سورج اور میں
سورج اور تم
ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے
سورج تو میرا ہم سفر ہے

ہلتے ہونٹوں کا رزمیہ

کنول خیالوں نے آنکھ کھولی
تو کچّی پگڈنڈیوں سے خوابیدہ راستوں پہ
دراز قامت جواں درختوں کے سانس بن کر ہوا کھڑی تھی۔
وہ دہشتوں کو محبّتوں میں بدلتی رُت تھی
سبھی کا جی چاہتا تھا آنکھیں پلک نہ جھپکیں
سبھی کا جی چاہتا تھا رقصِ سحاب دیکھیں
سبھی کا جی چاہتا تھا لطفِ خطاب پہنیں۔
وہ منظرِ جاں
کہ جس میں دہشت، محبّتوں میں بدل رہی تھی
وہ جشنِ خواہش کا مدّعا تھا

وہ سادہ قرطاس پہ معانی کا سلسلہ تھا۔
مجھے بھی سادہ ورق کے ساحل پہ
لفظ کشتی میں بیٹھ کے
وہ مراد ریزے سمیٹنے ہیں
کہ جس میں صحرا
وفا کی تاریخ کا مقدّر نہیں بنیں گے
کہ جس کی تاریخ میں عمل کی چراغ آنکھوں کو
ریت آلودہ کر نہ پائے
یہ لفظ کشتی
وہ حرفِ املا لکھے
کہ خاموشیاں تکلّم نژاد نکلیں۔
یہ لفظ کشتی
وہ مضطرب بادبان کھولے
کہ خواب لہروں پہ گھر بسانے کی خواہشیں
وہ جزیرہ دیکھیں
کہ جس میں دہشت محبّتوں میں بدل رہی ہو۔

○

سلگتی ریت پہ آنکھیں بھی زیرِ پا رکھنا
نہیں ہے سہل، ہوا سے مقابلہ رکھنا

اُسے یہ زعم کہ آغوشِ گُل بھی اُس کی ہے
جو چاہتا ہے پرندوں کو بے نوا رکھنا

سبک نہ ہو یہ نگہداریٔ جنوں ہم سے
یہ دیکھنے کو اُسے سامنے بٹھا رکھنا

بکھر نہ جانا جراحت نوازیٔ شب پر
مشامِ جاں کو ابھی خواب آشنا رکھنا

رہ فرصتیں کہ جنہیں آہٹوں کی خواہش ہو
انہیں جرس کی تمنّا سے ماسوا رکھنا

تمام منظرِ جاں اُس کی خواہشوں سے بنا
وہ خواب ہے تو اُسے خواب میں سجا رکھنا

اُداسیوں کو تو آنگن ہی چاہییں خالی
چھتوں پہ چاندنی راتوں کا سلسلہ رکھنا

وہ جب بھی آیا بہت تیز بارشوں جیسا
وہ جس نے چاہا مجھے سرمئی گھٹا رکھنا

بس اک چراغ مسافت کا بوجھ سہہ لے گا
سخن کے بیچ، طلب گاریٔ وفا رکھنا

○

لگتا ہے اب تو شہر میں رہتا نہیں کوئی
زندانیٔ ستم ہیں یہ کہتا نہیں کوئی

رکھتے ہیں ریزہ ریزہ ملامت سمیٹ کر
غارت گری کا درد بھی سہتا نہیں کوئی

سوکھا سا پڑ گیا ہے زمیں، آسمان میں
دریا روانیوں میں تو بہتا نہیں کوئی

زنجیر، دل کے پیچ بھی ہلتی نہیں کوئی
دیوانہ سرکشیدہ بھی رہتا نہیں کوئی

اب تو بدن کے جلنے کی بو شہر بھر میں ہے
کہنا بھی ناروا ہے، سو کہتا نہیں کوئی

○

اے رہِ ہجرِ نو فروز، دیکھ، کہ ہم ٹھہر گئے
یہ بھی نہیں کہ زندہ ہیں، یہ بھی نہیں کہ مر گئے

خواب تلک رہائی تھی تیرے فراق و ہجر سے
آنکھ کھلی تو آئینے تہہ میں کہیں اُتر گئے

تو بھی مری طرح رہا، دھیان اُٹھائے شہر کا
لوٹے تو چھاؤں سو گئی، قافلے کوچ کر گئے

تجھ کو بہت قریب سے دیکھ کے یوں لگا کہ اب
خیمۂ جاں اُکھڑ گیا، دشتِ طلب گزر گئے

دل کی گواہی کے لیے رسمِ دعا بُری نہ تھی
رنجِ خمارِ بے ثمر ڈھونڈنے اُس کے گھر گئے

ہم ہی تھے وہ بلا کشاں، دار و رسن تھے جن کی جاں
ہم ہی تھے شب کے ہم سفر، ہم ہی نہ اپنے گھر گئے

دل کو ترے فراق کی آرزو یاد رہ گئی
دن وہ محبتوں کے بھی مثلِ رہِ سفر گئے

میرے لئے بھی خواب تھے اُس نے رکھے ہوئے کہیں
شہر میں اُن کو ڈھونڈنے قاصدِ بے ہنر گئے

I 'm hunting for the truth, and not just a factual one, because behind everything that happens to you, every act, there is another truth, a secret life.

. Anne Sexton